بنیادی حقوق

کہا جاتا ہے کہ اس قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلیے وہ بنیادی حقوق (Fundamental rights) بالکل کافی ہونگے جنکا اعلان کراچی کانگریس میں کیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلان اہل انگلستان ہے جسے ایک طویل نزاع اور کشمکش کے بعد رعایا کے نمائندوں کی ایک مجلس (Convention) نے وضع کیا تھا تاکہ حکومت کے مستبدانہ افعال کی روک تھام کی جائے، اور حکومت و رعیت کے درمیان کچھ حدود معین کر دیے جائیں جنہیں توڑا نہ جاسکے۔ اسکے بعد امریکہ کے "اعلان آزادی" اور "اعلان حقوق انسانی" میں انہی حقوق کو بطور اصول عامہ کے درج کیا گیا۔ پھر ۱۸۳۱ء کے دستور نامۂ بلجیم میں ان کو شامل کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ گویا ایک قاعدہ سا بنگیا ہے کہ ہر دستور میں باشندوں کے ان حقوق کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید زمانہ کا کوئی دستور ان سے خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر بعد کے دستور میں چند حقوق کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ: قانون کی نگاہ میں سب باشندے مساوی ہیں۔ کسی شخص کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جاسکتی جب تک کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، اور سزا قانون ہی کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ حکومت رعایا کی شخصی آزادی اور جائداد میں صرف قانون ہی کے ذریعہ سے مداخلت کرسکتی ہے۔ تقریر اور نشر و اشاعت کی عام آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ قانون قذف (Law of Libel) کے خلاف نہ ہو۔ ڈاک اور تار کے پیغامات میں رازداری قائم رکھی جائیگی۔ باشندوں کو اجتماع کا حق حاصل ہوگا

بشرطیکہ غیر مسلح ہوں اور امن عام کو نقصان نہ پہنچائیں۔ انتخابات آزاد ہونگے۔ پارلیمنٹ کے ارکان باز پرس سے محفوظ رہینگے۔ ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا الا یہ کہ کوئی ممبر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے۔ ان کے علاوہ جدید زمانہ کے دستوروں میں جن باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہیں۔ یہ حقوق دراصل اس لیے وضع کیے گئے تھے کہ جب کبھی حکومت اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے تو رعایا کے پاس اپنی شخصی آزادی اور اپنے ذاتی حدود کی حفاظت کیلیے کوئی قانونی بنیاد موجود رہے، جسکی بنا پر وہ حکومت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکے، یا اگر حکومت نہ مانے اور رعایا کو لڑنا پڑے تو حکومت کا اخلاقی پہلو کمزور رہو۔ لیکن اول تو زمانۂ حال میں سیاسی تصورات کے انقلاب نے حکومت اور رعایا کے درمیان ہر اُس حد بندی کو توڑ دیا ہے جس کا خیال کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ اب یہ بتانا قریب قریب محال ہو گیا ہے کہ حکومت کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں اور افراد رعیت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ اعلان حقوق صرف اس صورت میں کام آسکتا ہے جب کہ جمہورِ قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ناروا مداخلت ہو اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد اپنے حقوق کی حفاظت کیلیے کھڑی ہو جائے۔ مگر جہاں اکثریت کی حکومت ہو اور وہ اقلیت کے حقوق میں مداخلت کرے وہاں یہ اعلانِ حقوق قطعی بے کار ثابت ہوتا ہے۔ ثالثاً کراچی کے ریزولیوشن میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ بجائے خود بھی ہمارے کسی مرض کی دوا نہیں۔

ان تینوں نکات کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ عام ناظرین اس اہم بحث کو بآسانی سمجھ سکیں۔

(۱)

حکومت کے حدود عمل کیا ہیں؟ اس باب میں دنیا کے نظریات اور عملیات اٹھارویں اور

انیسویں صدی میں جو کچھ تھے، آج ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اٹھارویں صدی میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور لوگ انکے استبداد سے نجات حاصل کرنے کیلیے جدوجہد کر رہے تھے اسلیے لوگوں کے ذہن پر حکومت اور رعیت کے تعلق کا مشینی نظریہ (Mechanical Theory) مستولی تھا یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ افراد کا مجموعہ ایک الگ چیز ہے اور اسٹیٹ ایک دوسری چیز، اور ان دونوں میں باہم کچھ اس طور پر معاملہ ہوتا ہے جیسے بائع اور مشتری یا اجیر اور مستاجر کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اسی خیال نے اسٹیٹ کے حدود عمل کا انفرادی نظریہ (Individualism) پیدا کیا جس کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز فرد کی آزادی ہے۔ اُسی کی حفاظت کیلیے فرد اُس معاہدۂ عمرانی (Social Contract) میں شریک ہوتا ہے جسکی بدولت اسٹیٹ وجود میں آیا ہے۔ لہذا اسٹیٹ کا کام اسکے سوا کچھ نہیں کہ افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور ایک فرد کی آزادی میں دوسرے کی مداخلت کو روکے۔ جان و مال کی حفاظت، امن قائم کرنا، انصاف کرنا، اور حدود مملکت کو بیرونی حملوں سے بچانا، بس یہ اسکے فرائض ہیں۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر اشخاص کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا، خواہ وہ اشخاص کی بھلائی ہی کیلیے ہو، اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ ہو، بہر حال ناجائز ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ عام خیال تھا اور اسی بنا پر بعض علمائے سیاست نے ان کاموں کی ایک فہرست بھی بنا دی تھی جو حکومت کے دائرۂ عمل میں آسکتے ہیں۔

یہ تخیلات اُس زمانے میں بھی قائم رہے اور کافی مدت تک چلتے رہے جب شخصی حکومتوں کی جگہ جمہوری حکومتیں لے رہی تھیں۔ مدتوں تک لوگوں کو محسوس نہ ہوسکا کہ جمہوریت اور دائرۂ حکومت کی حد بندی دونوں باہم متضاد ہیں۔ جب سوسائیٹی خود اسٹیٹ بناتی ہے تو وہ اپنے اوپر خود کس طرح پابندی عائد کرسکتی ہے، اور اسکو اپنے اوپر ایسی پابندی عائد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ وہ اسٹیٹ

کو اسی لیے تو وجود میں لاتی ہے کہ جبر۔۔ اور تنظیم کی طاقت سے اپنی ان اجتماعی ضروریات کو پورا کرے جن کے لیے تنظیمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ وہ اس تنظیمی طاقت کے استعمال کو اپنی بعض ضروریات کیلیے جائز اور بعض کیلیے ناجائز ٹھہرائے؟ اس حد بندی کی ضرورت تو اس وقت تھی جب حکومت سوسائٹی سے الگ۔۔۔۔ ایک چیز ہوتی تھی اور کہیں اوپر سے آکر مسلط ہو جایا کرتی تھی۔ مگر جب خود سوسائٹی ہی سے حکومت پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس حد بندی کی کیا حاجت؟

فرد، سوسائٹی اور اسٹیٹ کو ایک زندہ نظام جسمانی کی طرح سمجھنے کا یہ تخیل (Organic Theory of State and Society) جمہوری افکار کے ارتقار کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتا چلا گیا اور سوشلزم نے آکر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب دنیا میں ہر جگہ حکومت کے دائرۂ عمل کی حدیں ٹوٹ کر پوری اجتماعی زندگی پر پھیل رہی ہیں۔ تمدن، معاشرت اور معیشت کی جڑوں تک میں اتر تی جا رہی ہیں، اور جزئی سے جزئی معاملات تک کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جاتی ہیں۔ باشندوں کی روٹی کا بندوبست کرنا، انکے لیے کام مہیا کرنا، انکے معیار زندگی کو بلند کرنا، اور انکے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش بہم پہنچانا، یہ ہیں اب حکومت کے فرائض۔ ان فرائض کو انجام دینے کیلیے وہ ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے استعمال کرنے پر مجبور ہے، اور اس طرح گویا پوری معاشی زندگی اپنے صنعتی اور تجارتی اور مالی شعبوں سمیت حکومت کے دائرے میں آجاتی ہے پھر وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی کیلیے تعلیم کا بھی پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہے تاکہ باشندوں کو ان اغراض کیلیے کار آمد بنا سکے۔ مزید براں ان فرائض کی بجا آوری یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ افراد یا افراد کے مختلف مجموعوں کی شخصی آزادی یا انکی انفرادی خواہشات، یا انکے مخصوص حقوق کا ہر حال میں لحاظ کیا جا سکے۔ ان سب چیزوں کا صرف اسی حد تک خیال رکھا جا سکتا ہے اور اسی شرط کے ساتھ رکھا

جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ادائگی میں حارج نہ ہوں۔ جہاں وہ حائل ہونگے وہاں انکی انفرادیت کو پامال کر دیا جائیگا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ اس فیصلہ میں خود مختار ہو کہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلائے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے جس طرح مناسب سمجھے ان کو تیار کرے۔ تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی اب انفرادی آزادی یا گروہی آزادی کا حق مسلّم نہیں ہے۔ حکومت اجتماعی فلاح کیلیے تمدن و معاشرت میں جس قسم کا تغیر ضروری سمجھے کر سکتی ہے، حتیٰ کہ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ فلاں طرز کا لباس پہنو اور فلاں طرز کا نہ پہنو، فلاں رسم الخط استعمال کرو اور فلاں کو چھوڑ دو، اس عمر میں شادی کرو اور اس عمر میں نہ کرو، وعلیٰ ہذا۔ اسی طرح جب تک وہ باشندوں کی معاشی فلاح و ترقی کی ذمہ دار ہے تو وہ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور اموال و املاک کے باب میں بھی لوگوں کے شخصی حقوق کی رعایت ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجبور ہے کہ معیشت کی پوری مشین کو ایک اجتماعی مقصد کے مطابق چلائے اور جو شخصی حقوق اس راہ میں حائل ہوں انہیں پامال کر دے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جنکی بنا پر حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تاجر کے مال کو جبراً فروخت کرا دینا، شخصی املاک پر بمعاوضہ یا بلا معاوضہ قبضہ کر لینا[1]۔ باشندوں کی سکونت یا نوآبادکاری یا ترقی زراعت کے لیے اگر ضرورت ہو تو زمینوں کو بلا معاوضہ ضبط کر لینا[2]۔ موروثی جائداد اگر ایک حد خاص سے زیادہ ہو تو اسے چھین کر تقسیم کر دینا[3]۔ وراثت میں اسٹیٹ کا حصہ مقرر کرنا[4]۔ حتیٰ کہ پرائیویٹ کاروبار کی

---

۱ دستور جرمنی دفعہ ۱۵۳ پارۂ دوم۔ دستور پولینڈ دفعہ ۹۹۔ دستور چیکوسلواکیا دفعہ ۱۰۹

۲ ایضاً دفعہ ۱۵۵

۳ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۴۲۔ ایستھونیا، لیتھویا اور لتھوانیا میں اس مضمون کے قوانین پاس کیے گئے ہیں۔

۴ دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴۔ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۳۹۔

تنظیم اور مراسلت و مخابرت میں بھی مداخلت کرنا اگر اجتماعی مفاد کیلیے اسکی حاجت ہو۔[۱]

حکومت کے دائرے کی اس وسعت اور لامحدودیت نے اول تو بنیادی حقوق کو محض بے معنی بنا دیا ہے، کیونکہ جن حقوق کو انسان کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کہا جاتا ہے ان سب کو آج کی حکومت اجتماعی فلاح کے نام سے سلب کر سکتی ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے والی چیز اکثریت ہوتی ہے، اور یہ فیصلہ کرنا بھی اکثریت ہی کا کام ہوتا ہے کہ اجتماعی فلاح کیا ہے اور اسکا اقتضاء کیا ہے۔ لہذا اب اکثریت کے ظلم وجور اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اسکی قاہرانہ مداخلت کیلیے کھل جاتے ہیں۔ وہ اسکے تمدن اسکی معیشت و معاشرت اور اسکے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کر سکتی ہے، اور تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لیکر اسکی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کر سکتی ہے۔

(۲)

بنیادی حقوق اگر کسی حد تک کام آسکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ باشندگان ملک کی بڑی اکثریت ان کی حفاظت کا ارادہ رکھتی ہو اور اتفاقاً کوئی ایسی گورنمنٹ ملک پر مسلط ہو گئی ہو جو ان حقوق کو سلب کرنا چاہتی ہو۔ رہی یہ صورت کہ خود وہ اکثریت ہی ظلم پر اتر آئے جو حکومت جمہوریہ کو چلا رہی ہو، تو ایسی صورت میں بنیادی حقوق کی کوئی لمبی سے لمبی فہرست بھی اقلیت کے کام نہیں آسکتی۔

خود برطانیہ عظمیٰ کی مثال لے لیجیے جہاں سے ان بنیادی حقوق کی ابتدا ہوئی ہے۔ ۱۸۲۸ء تک وہاں پارلیمنٹ اور مجالس بلدیہ اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کیلیے چرچ آف انگلینڈ

[۱] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۵۷۔

کے طریقہ پر عشائے ربانی لینا لازم تھا۔ ۱۸۲۹ء تک کیتھولکس ہر قسم کی نمایندگی سے محروم تھے ۱۸۶۷ء تک یہودی پارلیمنٹ میں نہ جا سکتے تھے ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ اور کیمبرج کے دروازے ان لوگوں کیلیے بند تھے جو پراٹسٹنٹ مذہب کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں، اور ۱۸۷۱ء تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں ایسے کسی شخص کو کسی قسم کا عہدہ یا امتیاز یا وظیفہ تعلیمی نہ مل سکتا تھا۔ ۱۸۸۱ء تک چرچ آف انگلینڈ کی پیروی نہ کرنے والوں کیلیے دفن اموات کے بارے میں طرح طرح کی قیود موجود تھیں ۱۸۸۸ء تک عدالت میں شہادت دینے والوں کیلیے حلف کی نارواقیود پائی جاتی تھیں۔ اور آئرلینڈ کی اقلیت کیساتھ تو ۱۹۲ء تک جو کچھ ہوتا رہا وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کی مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی آباد ہیں جنکا تناسب کل آبادی میں ۹ فیصدی سے کچھ زیادہ ہے۔ دستور کی رو سے ان کو سفید فام امریکیوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں۔ جمہوری دولت مشترکہ میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں۔ اور قانون میں کوئی چیز ایسی نہیں جسکی بنا پر سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز کیا جا سکتا ہو۔ مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ سفید فاموں کی اکثریت انکے ساتھ کھلم کھلا امتیازی برتاؤ کر رہی ہے شہری حقوق تو درکنار ان کے معمولی انسانی حقوق تک علانیہ سلب کیے جا رہے ہیں اور دستور کے عطا کردہ بنیادی حقوق ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سفید فاموں کے کلیساؤں میں وہ گھس نہیں سکتے۔ انکے ہوٹلوں، ریسٹوران اور تھیئٹروں میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ انکی تفریح گاہوں میں کوئی حبشی اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ موٹر بسوں اور ریل کے ڈبوں میں بھی سفید فام کیساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں رکھا جاتا۔ سفید فاموں کے محلوں میں کوئی حبشی مکان نہیں لے سکتا۔ انکے بچوں کے ساتھ حبشی کا بچہ ایک مدرسہ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ انکے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے سے بھی مہذب گوروں کا ضمیر ابا نہیں کرتا، اور بہت ہی کم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی

حبشی کی خاطر کسی گورے کے خلاف قانون کی مشین حرکت میں آتی ہو۔

یہاں اس برتاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں جو امریکہ کی اکثریت حبشی اقلیت کیساتھ کر رہی ہے۔ مگر میں اختصار کیساتھ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں اکثریت اور اقلیت کو نسل یا رنگ یا مذہب یا کسی اور چیز نے حقیقتہً ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہو وہاں اکثریت کی حکومت کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور دستور اور اسکے بنیادی حقوق اور قانون اور اسکی کاغذی دفعات کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔

امریکہ میں حبشیوں کے متعلق بغیر کسی سائنٹفک بنیاد کے یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطۂ نظر سے (Biologically) وہ تعلیم کیلیئے نا اہل ہیں اور عمرانی نقطۂ نظر سے (Socially) ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنا دینا ہے، یعنی پھر وہ خدمتگار بننے کے بجائے برابر والے بننے لگیں گے اس بنا پر بعض ریاستوں میں انہیں تعلیم دینا حکماً ممنوع تھا اور بعض ریاستوں میں اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ کئی سال تک حبشی خود اپنی کوششوں سے اور اپنے روپے سے مدارس قائم کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے دماغی قابلیت دنیا پر ثابت کر دی تب ۱۹۰۵ء سے انکے مدارس کو سرکاری امداد ملنے کا سلسلہ شروع ہوا

قانون کی نگاہ میں حبشی اور سفید امریکن عملاً برابر نہیں ہیں اگرچہ لفظاً برابر ہیں۔ حبشی کیلیئے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو اوسطاً ۱۷ مہینہ اور سفید فاموں کو اوسطاً ۹ مہینہ کی سزائیں دی گئیں۔ آبادی میں تو حبشیوں کا تناسب ۹ فی صدی ہے مگر جیل خانوں کی آبادی میں ان کا تناسب ۳۱ فیصدی۔

۱۸۸۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی میں	۲۴۴ تھے	اور سفید فام	۹۶
۱۸۹۰ء ״ ״ ״	۲۶۴ ״	״	۸۴

سنہ ۱۹۰۴	میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ہیں			۲۷۸ تھے	اور سفید فام		۷۷
سنہ ۱۹۱۰	״	״	״	۳۸۴	״	״	۸۹
سنہ ۱۹۲۳	״	״	״	۳۲۷	״	״	۷۷

اس طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے مگر حبشیوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے[1]۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ حبشی زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کیلیے مقرر کیا گیا تھا جو Chicago Commission of Racial Relations کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "جس شہادت کو جیوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کیلیے کافی سمجھتی ہے وہی شہادت ایک سفید فام کو سزا دینے کیلیے ناکافی سمجھی جاتی ہے"۔ ایک دوسرے جج نے کہا کہ "ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فام پر شاذ و نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے"۔ شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> "تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید فاموں کے زیادہ پکڑے جاتے ہیں، کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ حبشی زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں۔ رہا سفید فام تو اس پر ذرا احتیاط ہی سے ہاتھ ڈالنا چاہیے ...... ایک ایک جرم میں بہت حبشی پکڑ لیے جاتے ہیں لہذا محض قید خانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں..... سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے"۔

---

[1] *Encyclopædia* Britannica. Article : Negros in America

[2] اس کمیشن کی رپورٹ (Negros in Chicago) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ تو قانون کا حال ہوا - اور وہ اکثریت جو جمہوری نظام کو چلا رہی ہے؟ اس کا کیا حال ہے؟ حق رائے دہی پر عملاً ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ حبشیوں کی ایک بڑی تعداد "شہری" (Citizen) ہونے کے باوجود خود بخود ووٹ دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے - سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کیلیے گویا بند ہیں - آج تک کوئی حبشی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز نہ ہو سکا - البتہ جنگ میں توپوں کا ایندھن بننے کیلیے وہ ضرور بھیجے گئے تھے اور اب بھی اس کام کیلیے تیار کیے جا رہے ہیں -

عامۃ الناس ان کو صرف ملیچھ ہی نہیں سمجھتے بلکہ بات بات پر فساد ہوتے ہیں اور ان کو نہایت بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے - ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ شکاگو میں یکایک افواہ اڑی کہ کسی حبشی نے ایک اٹالین لڑکی کو مار ڈالا ہے - اس پر سفید فام لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور اس نے ایک راہ چلتے حبشی پر حملہ کر دیا - کارونر کی عدالت میں جب اسکی لاش پیش ہوئی تو ۱۴ گولیاں اسکے جسم سے نکلیں، کھوپڑی چور چور پائی گئی اور پسلیوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے - بعد میں معلوم ہوا کہ اٹالین لڑکی کے واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی - پریزیڈنٹ ولسن جب پیرس میں بیٹھے ہوئے جرمنوں کے مظالم پر ماتم فرما رہے تھے اس وقت شکاگو میں ایک حبشی زندہ آگ پر بھونا جا رہا تھا - امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنش کرنا (Lynching) کہتے ہیں - اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دیدیں - اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے، چنانچہ "نیویارک ورلڈ" نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۳۰۰۵ حبشی برسر عام لنش کیے گئے - لنشنگ عموماً اس قصور میں ہوتا ہے کہ کسی گوری عورت سے کسی حبشی کا تعلق پایا جائے یا ایسے تعلق کا شبہ کیا جائے - لیکن سفید فام امریکن کا ضمیر صرف اسی

وقت آمادۂ شورش ہوتا ہے جب کالا مرد گوری عورت کے پاس پایا جائے۔ رہی کالی عورت تو اس پر گوروں کے پیدائشی حقوق ہیں۔ حبشی کے متعلق عام رائے گورے صاحبان کی یہ ہے کہ وہ وحشی جانور (Brute) ہوتا ہے، اس کا معیار اخلاق بہت پست ہوتا ہے، بلکہ اس میں اخلاقی احساس ہوتا ہی نہیں۔ عورتوں اور بچوں پر حملہ آور ہونا اور بدمعاشی کرنا اسکی سرشت میں داخل ہے۔ گویا ہمارے ملک کے ہندو اخبارات کی زبان میں وہ ایک پیدائشی "غنڈا" ہوتا ہے۔ لیکن شکاگو کمیشن نے باقاعدہ تحقیقات کر کے ثابت کیا ہے کہ حبشی کا معیار اخلاق صاحب لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے، اور صاحب لوگ خود اپنی قوم کی عورتوں پر اور کالی عورتوں پر حملہ کرنے میں جس قدر بے باک ہیں حبشی غریب اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ البتہ حبشی سے جب یہ قصور ہو جاتا ہے (اور وہ بھی زیادہ تر میم صاحبات ہی کی دعوت اور اشتعال کا نتیجہ ہوتا ہے) تو صاحب لوگوں میں اس پر شور مچ جایا کرتا ہے اور یہی حبشی کے بدنام ہونے کی اصلی وجہ ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ نابالغ لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والا حبشی تو میری عدالت میں کبھی آیا ہی نہیں، البتہ سفید فام بہت سے آئے۔ ایک دوسرے جج نے بیان کیا کہ میری کل مدت ملازمت میں صرف ایک حبشی اس جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے حالانکہ سفید فام اکثر پکڑے ہوئے آتے ہیں۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں ایک خفیہ جماعت کام کر رہی ہے جس کا نام کو کلکس کلاں (Ku Klux Klan) ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فاموں پر سفید فاموں کے تفوق کی حفاظت کی جائے اور امریکہ میں کالی نسل کے مسئلہ (Negro Problem) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے[1]۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ تر طاقتور سنگھٹن ہے جس کے ارکان کی

[1] ۱۸۷۰ء سے اب تک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۳ سو فیصدی اضافہ ہوا ہے اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فیصدی کمی ہوئی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہیگا۔ یہ وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے اس ملک میں آباد تھی۔

تعداد ۱۹۲۳ء میں پندرہ لاکھ تھی۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائیٹی والے اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں۔ صوبوں کے گورنر، پولیس اور جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بڑے بڑے ہولناک جرائم کرجاتے ہیں اور کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ جیل کی کوٹھریوں تک سے قیدیوں کو نکال لے جاتے ہیں اور قانون کی مشین ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے۔ (America Comes of Age.) کا مصنف لکھتا ہے کہ "وہی مہذب و شائستہ جنٹلمین جس سے آپ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ رات کو وہ جنگل میں کسی آدمی کو قتل کرکے آیا ہو اور اسکے ساتھ اس جرم میں بہت سے وہ لوگ شریک ہوں جنہیں آپ دن کے وقت نہایت عزت وافتخار سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔" چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ریاست ٹیکساس Texas کے گورنر نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ مجرموں میں ایک تو پادری صاحب تھے اور متعدد ایسے لوگ تھے جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں؟ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ایک حبشن کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور ننگا کر کے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مر جائے۔ ایک حبشی کی ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے اپنی زمین کم قیمت پر ایک سفید فام شخص کے ہاتھ بیچ دی۔ ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے، رسیوں اور خاردار تاروں سے اسے باندھا، ہنٹر مار مار کر اسکی کھال ادھیڑی، پھر اسکے زخموں پر کریازوٹ چھڑک کر چل دیے اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔ ایک حبشن اور اسکے لڑکے کو پکڑ لے گئے اور دونوں کو ایک ریل کے پل سے باندھ دیا۔ ایک غریب کو ہسپتال سے اٹھا لے گئے اور اسکو زندہ آگ پر بھون ڈالا۔ ایک بے چارے کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی[1]۔ حبشی کا سب سے بڑا قصور جسے معاف نہیں کیا جا سکتا"

[1] یہ واقعات رسالہ "نیو ایج" میں شائع ہوئے ہیں۔

یہ ہے کہ وہ سفید فام آبادی میں یا اسکے قریب جائداد رکھتا ہو، یا سکونت اختیار کرے۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف شہر شکاگو میں ۵۸ مرتبہ ایسے مکانات کو بم سے اڑایا گیا جو حبشیوں نے خریدے تھے یا جو کسی سفید فام نے حبشی کو کرایہ پر دیئے تھے۔ ایک حبشی بنیکر (Binga) کے مکان اور دفتر پر ایک سال کے اندر ۶ مرتبہ بم پھینکا گیا، صرف اس قصور میں کہ وہ حبشیوں کے لیے مالی تقویت کا موجب بن گیا ہے، اسکے بنیک سے حبشیوں کو اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے، اور اسکی بدولت حبشی لوگ جائدادیں خریدنے لگے ہیں ـــ یہ واقعات ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حبشی ۱۹۰۷ء میں ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی کا ۱۹ فی صدی حصہ تھے وہ آج ۹ فی صدی رہ گئے ہیں[1]۔ اور لطف یہ ہے کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں حبشی اقلیت کے بنیادی حقوق بالکل محفوظ ہیں۔

جرمنی کی ایک اور مثال آپ کے سامنے ہے۔ جرمن کانسٹی ٹیوشن کی رو سے تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق مسلّم ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کیساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے ان کیلیے جرمنی کے حدود میں عزت کی روٹی کمانا قریب قریب محال ہو گیا ہے اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے ان کیلیے بند ہیں۔ تجارت بھی وہ آزادی سے نہیں کرسکتے۔ دوسرے آزاد پیشوں سے بھی ان کو نکالا جارہا ہے۔ عدالتوں میں انکے ساتھ کھلم کھلا نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کیلیے انصاف کا نظریہ، یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم ثابت نہ کردے۔ عام باشندے اگر ان سے لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابلِ برداشت پابندیاں ہیں اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کیلیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے تاکہ واپس نہ آسکیں۔ انکے والدین اگر ان سے ملنے کیلیے باہر جانا چاہتے ہیں تو انہیں بھی مہاجر کی حیثیت سے جانے کی اجازت دیجاتی ہے اور مہاجر کیلیے یہ قانون بنادیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس

[1] تفصیلات کیلیے کتب ذیل ملاحظہ ہوں :-
J. E. Cutter, Lynch Law. C. G. Woodson, The Negros in Our History E. B. Reuter, The American Race Problem.
M. J. Hersk[illegible]

فیصدی حصہ جرمنی سے باہر لے جاسکتا ہے، باقی سب ضبط۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی کونسا ملک ایسا ہے جسکے دستور اساسی میں بنیادی حقوق موجود نہیں ہیں؟ اور کونسا ملک ایسا ہے جہاں دستور کے بنیادی حقوق نے اقلیت کو اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو؟ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کرکے ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا اور دستور اساسی میں بنیادی حقوق مقرر کر دیئے گئے، مگر جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب یا نسل یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے، وہاں اکثریت کی یہی کوشش ہے کہ یا تو اقلیت اپنے قومی وجود کو اکثریت کی قومیت میں گم کردے یا پھر اسے شودر بنا کر رکھا جائے اور مختلف طریقوں سے اس کو فنا کر دیا جائے۔ یوگوسلیویا میں جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے اور اسے اٹانومی دیدی جائے۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ سربیوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ اس جواب کو لفظ بلفظ سن لیجیے:۔

"سرب، کروٹ اور سلافینی درحقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ بیرونی جوا ہمارے کندھوں پر سے اتر گیا ہے تو قومی وحدت کا احساس فتح یاب ہو کر ابھر آیا ہے اور اس نے ان تمام حدبندیوں کو توڑ دیا ہے جو سیاسی ادارت اور زبان اور مذہب نے پیدا کردی تھیں وحدت کے اس احساس کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کیلیے ضروری ہے کہ قدیم جغرافی تقسیم جسکے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا، منسوخ کردی جائے۔ مقامی نظم و نسق کیلیے صوبوں کی بالکل نئی تقسیم ہونی چاہیے تاکہ بڑے صوبوں کی حدبندیاں نسلی حلقے (Racial Groups) نہ بنا سکیں[1]"

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں کہ آزاد ہندوستان میں جواہرلال نہرو تقریر فرما رہے ہیں؟ یہ گویا ایک قاعدۂ کلیہ سا بن گیا ہے کہ واحد قومیت کا جو شبلا وعظ وہی قوم کہا کرتی ہے جسکا سو فی صدی فائدہ اسی وعظ میں ہوتا ہے۔ اور وہ بے وقوف لوگ بعد میں پچھتاتے ہیں جو آزادی کے جوش میں تو "ایک قوم ایک

[1] A. H. Morley, The New Democratic Constitutions of Europe

ملک" کی صدائیں بلند کیا کرتے ہیں، مگر جب آزادی کے بعد واحد قومیت اژدھے کی طرح ان کو نگلنا شروع کرتی ہے تو غیظ کے مارے بل کھاتے ہیں اور قدرت کا یے لاگ قانون ان احمقوں سے پکار کر کہتا ہے کہ موتوا بغیظکم ــــ جس وقت یوگوسلیویا کی نیشنل اسمبلی میں کروٹس کے اعتراضات کا مذکورۂ بالا جواب دیا گیا تو سنا ہے کہ کروٹ نمایندے احتجاجاً اسمبلی سے اٹھ گئے اور انکے جانے کے بعد سربی اکثریت نے اور زیادہ آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ پاس کر لیا جو وہ پاس کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بنیادی حقوق دور کھڑے ہنستے رہے اور کہتے رہے کہ "کہو! کیسا بے وقوف بنایا"!

(۳)

اب ذرا ان بنیادی حقوق کا بھی تجزیہ کر دیکھیے جو کراچی ریزولیوشن میں تجویز کیے گئے ہیں اور جنکی بنا پر ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی ملک بھر میں مسلمانوں کو سمجھاتے پھرتے ہیں کہ بھائیو! کانگریس تو پہلے ہی تمہارے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے، اب تم کیوں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ایک آزاد جمہوری اسٹیٹ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتے؟

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کیلیے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں ــــ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے۔ اصول جمہوریت کی بنا پر، قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اسکو نافذ کریگی۔ لہذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض انکے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو ــــ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا

اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہمکو دے رکھی ہے، مگر اسکے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مردہ ہوکر رہ گئی۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً ناآشنا، اور بالکل مختلف قسم کے نظریات تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونیکا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں بزور نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائیگا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائیگا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں توڑی نہیں جائینگی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائیگا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہوکر خود بخود آثار قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچینگے بلکہ مدرسے کے معلم نہایت شفقت و رحمت کیساتھ انکے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کرینگے جسکی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کرینگی۔ یہ آزادی محض ایک افیون ہے تاکہ اسکی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گردوپیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لیکر جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں انکے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہ محض اس امر کی ضمانت ہے کہ موجودہ نسل کے جو لوگ اپنی مذہبیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں انکی گردن پر چھری رکھکر زبردستی کلمۂ کفر نہیں کہلوایا جائیگا۔ مگر یہ اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ انکی آئندہ نسل کو غیر مسلم بنانے والی تعلیم و تربیت نہ دیجائیگی۔ اس تحفظ کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ اگر چاہیں تو قال اللہ وقال الرسول میں مشغول رہیں۔ آپکی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائیگی، نہ آپکی عبا ضبط کی جائیگی، نہ آپکی تسبیح چھینی جائیگی، نہ آپکی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ نسل کو بھی اس "غلط فہمی" میں مبتلا

رہنے دیا جائیگا کہ اسلام ہی سچا دین ہے، اور تمام مذاہب سے برتر اور اصلح ہے - مذہبی آزادی کا یہ پروانہ لیکر جو صاحب خوش ہونا چاہتے ہیں، وہ خوش ہولیں - ہمیں تو اس پروانہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارا مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت تو معقولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے - ہم تو استقلال وطن اسلیے اور صرف اسی لیے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کرسکیں - اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی -

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائیگی ـــــ حکومت کے روپے اور اسکی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے - اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مرجائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں - درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور انکی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائیگی، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ انکو زبردستی قتل نہ کیا جائیگا - باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ کر مر جائیں، تو حکومت پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یو - پی کے وزیر تعلیم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے کہ انکا سوکھ سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے تاکہ انکی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے - ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہمکو انگریزی حکومت میں حاصل ہے - اس نے بھی ہمکو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورنیکلر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں - لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی - اگر یہی حالت اس حکومت میں بھی ہو جسکو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے، تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اسلیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اس طرح غذا دے سکیں جسطرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی قومی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے اسکے لیے ہمیں کسی جنگ آزادی کی کیا ضرورت ہے؟

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز انکے درمیان نہ ہوگا ــــ یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنیکا قانون پاس کردے اور اسکی مخالفت کرنیوالی اقلیت کا اسیطرح مذاق اُڑائے جسطرح ابھی چند روز ہوئے مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جاچکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کسی کام نہ آئیگی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اسکے مذہب یا جات پات، یا عقیدہ و مسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائیگی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہوسکے ــــ اس دفعہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظام حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبۂ عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے ــــ یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی، جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رو سے گائے کی قربانی بند کی جاسکتی ہے، اگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجاکر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جنکے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنیکے لیے جنگ کریں، جسکی پالیسی کی تشکیل، جسکے قوانین کی تشریع اور جسکے احکام کی تنفیذ میں ہم واحد قومیت، اور اصول جمہوریت کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کرسکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اسلیے حاصل کی جا رہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اسکے بیٹے کو تخت نشین کرادیں، رہا ہمارا اپنا حال، تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابنِ فرعون اطمینان دلاتا ہے کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہے گی!